مذہب اور سائنس اقبال کی نظر میں[1]

محمد رضی الدین صدیقی

طلوع اسلام سے قبل مذہبی پیشواؤں کی منظم کوشش تھی کہ عوام الناس کو پڑھنے لکھنے سے باز رکھا جائے تاکہ وہ وہم اور جہالت میں مبتلا رہیں اور پیشواؤں کی گرفت ان پر مضبوطی سے قائم رہے۔ انہیں ڈرایا جاتا تھا کہ اگر انہوں نے علم حاصل کرنے کی ذرا بھی کوشش کی تو سخت سزا اور عذاب کے مستحق ہوں گے۔ لکھنے پڑھنے کے متعلق مذہبی پیشواؤں کی اس اجارہ داری اور عوام الناس کو جاہل رکھنے کی سازش کے خلاف سب سے پہلا جہاد اسلام نے کیا اور امت مسلمہ کے ہر فرد کو علم حاصل کرنے کی تاکید کی۔ قرآن کریم میں لکھنے سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی بار بار تلقین کی گئی اور مظاہر قدرت کو خدا کی نشانیاں بتایا گیا۔ جن کو دیکھ کر انسان دور رس نتیجے اخذ کرتا اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

شارع علیہ الصلوۃ و السلام نے بھی تحصیل علم کو فرض قرار دے کر اور علم کو اپنا ہتیار بتلا کر امت کے ہر فرد کو غور و فکر کی ترغیب دی۔ اسی ذہنی انقلاب اور توہم پرستی سے آزادی کا نتیجہ تھا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے سیاست اور تمدن کے علاوہ علم و فن کے میدان میں بڑی فتوحات کیں اور کوئی پانچ سو سال تک علمی دنیا کی رہبری کا فرض انجام دیا۔ میں نے ایک سابقہ مضمون میں بتایا ہے کہ مشاہدہ اور نظریہ کے امتزاج سے جدید سائنس کی بنیاد درحقیقت مسلم علماء ہی نے رکھی ہے اور اب تو مغربی

۱۔ یہ مقالہ اقبال اکادمی کے زیر اہتمام یوم اقبال کے موقع پر کراچی میں بتاریخ ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء پڑھا گیا۔

مورخین بھی اس امر کی شہادت دینے لگے ہیں کہ اس اولیت کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔

اب یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد ہوتا یا عقل سلیم کو استعمال کرنے کی ممانعت ہوتی تو قرون اولیٰ کے وہ مسلمان جو رسول کریم صلعم کے زمانے سے قریب تر تھے اور اسلام کی تعلیم سے بخوبی واقف تھے، علم و فن میں اس قدر انہماک کو کیسے گوارا کرتے اور علوم فطرت میں اس قدر ترقی کیسے کرتے۔ یہ اسلام ہی کی تعلیم کا نتیجہ اور اس کی پیدا کی ہوئی وسعت نظر تھی جس کی بدولت مسلمانوں میں یہ ذوق و شوق پیدا ہوا اور انہوں نے علمی تحقیقات اور سائنسی انکشافات میں اپنے جوہر دکھلائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی گوشہ سے علم و فن کی توسیع اور اشاعت کے خلاف کوئی آواز اٹھی تو بعض اکابرین امت نے اس تنگ نظری کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ ان بزرگوں میں ایک قابل ذکر ہستی امام غزالی رح کی ہے جنہوں نے اپنی معرکۃ الآرا تصانیف ''احیاء علوم الدین'' اور ''المنقذ من الضلال'' میں ایک نہایت متوازن نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ حضرت امام کی موخرالذکر کتاب سے چند مقولے اس موقع پر نامناسب نہ ہوں گے وہ فرماتے ہیں :-

''ایک آفت اس شخص کی پیدا کردہ ہے جو اسلام کا نادان پیرو ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مذہب کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہر علم و حکمت کا انکار کیا جائے اور ان علوم کو جہل قرار دیا جائے۔ اس معاملہ میں اس شخص کا غلو اس درجہ ہوتا ہے کہ وہ چاند گرہن اور سورج گرہن کے نظریوں کا بھی انکار کرتا ہے اور اس زعم میں مبتلا ہوتا ہے کہ ان گرہنوں کے متعلق جو کچھ حکما نے کہا ہے وہ خلاف شرع ہے۔ جب اس شخص کی باتیں کوئی ایسا آدمی سنتا ہے جو ان علوم سے قطعی دلائل کی بنا پر واقف ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اسلام جہل اور قطعی دلائل سے انکار پر مبنی ہے۔ لہٰذا اگر یہ نادان پیرو سمجھتا ہے کہ مذہب کو ان علوم کے انکار سے تقویت پہنچتی ہے تو دراصل وہ مذہب کے حق

میں ایک عظیم جرم کا مرتکب ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شرع میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ان علوم کے متعلق منفی یا مثبت طور پر کہی گئی ہو۔ اسی طرح ان علوم میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مذہب کے خلاف ہو۔'' (المنقذ ص ۲۵)

میں نہیں سمجھتا کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہ ہونے کے متعلق اس سے زیادہ واضح طور پر کچھ کہا جاسکتا ہے جیسا کہ امام غزالی رح نے کہا ہے ۔ اگرچہ ان کی یہ تحریریں گیارھویں صدی میں دنیا کے سامنے پیش کردی گئی تھیں لیکن مغرب کے ازمنہ وسطیٰ میں کلیسائیت کا وہی تسلط برقرار رہا اور امام غزالی کی توضیحات کے صدیوں بعد بھی گلیلیو جیسے عظیم سائنس دان کو محض زمین کی حرکت کا ذکر کرنے پر سزا کا مستحق قرار دیا گیا ۔ اسی کلیسائی عقیدے کا اثر تھا کہ کپلر جیسے ماہر فلکیات نے جس کے مشاہدات پر نیوٹن کے قانون تجاذب کی بنیاد رکھی گئی ، سیاروں کی حرکت کی توجیہ یوں کی کہ ہر سیارہ میں ایک روح ہوتی ہے جو اس کو سورج کے گرد چکر دیتی ہے ۔ حاصل یہ کہ سائنس کو اسی اندیشہ سے مسخ کیا جاتا رہا کہ کہیں وہ مذہب کی مد مقابل نہ بن جائے ۔

پھر اس شدید مذہبی تعصب کا رد عمل بھی شدید ہونا لازمی تھا ، چنانچہ جب مغرب کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا تو وہاں کے علمی حلقوں میں الحاد اور لا ادریت کی تحریک زور پکڑتی گئی اور لوگوں نے مذہب کو سائنس کے اصولوں پر پرکھنا اور ان پر پورا نہ اترنے کے باعث مسترد کرنا شروع کیا ۔ جن لوگوں نے مذہب سے قطعی انکار نہیں کیا انہوں نے بھی اس کو خدا اور بندے کے درمیان ایک خانگی معاملہ قرار دے کر دنیاوی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا ۔ اہل مغرب کے یہ مادی نظریات ان کے سیاسی غلبہ اور حکومت کے ساتھ ساتھ مشرقی ممالک میں بھی پھیلتے گئے اور برصغیر کے مسلمان بھی ان سے محفوظ نہ رہ سکے ۔

انیسویں صدی کا یہی آخری زمانہ تھا جب اقبال نے ہوش سنبھالا اور ملت اسلامیہ کے نوجوان افراد کو جنہوں نے کسی قدر جدید تعلیم حاصل کی

تھی مذہب کو سائنس کے منافی سمجھ کر اس سے بیگانہ ہوتے ہوئے دیکھا ۔ تھوڑا بہت لکھ پڑھ کر گمراہی اور مادہ پرستی میں مبتلا ہونے والے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت کے لئے اقبال نے ضروری سمجھا کہ اس زہر ہلاہل کا جو ملت کے جسد اجتماعی میں سرایت کرتا جا رہا ہے تریاق پیش کریں اور عقل محض کی خامیوں اور کمزوریوں کو اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والے علم اور تجربہ کے نقائص کو واضح کریں تاکہ یہ علم کہیں حجاب اکبر نہ بن جائے ۔

لیکن افسوس ہے کہ اقبال پر بعض لکھنے والوں نے ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ان کی چند نظموں اور اشعار کو لیکر جو جدید تہذیب کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر اپنے شعار ملی سے غفلت یا انکار کرنے والوں کو جھنجوڑنے کے لئے اقبال نے لکھے تھے ، ان خیالات کے متعلق غلط تاثر پیدا کیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض موقعوں پر اقبال نے عقل کے محدود ہونے کا بیان ضروری سمجھا ہے لیکن اس سے ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ عقل اور فکر کی تنقیص کی جائے ۔ ان کے منظوم کلام اور خطبات میں بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں انہوں نے عقل و خرد اور اس پر مبنی علم و حکمت کی اہمیت جتائی ہے اور مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ وہ تسخیر فطرت کی خاطر علم و فن میں کمال حاصل کریں اور اس طرح ملت اسلامیہ کو وسیع اور مستحکم بنائیں ۔ اپنے خطبات میں تو انہوں نے خاص طور پر بتایا ہے کہ نہ صرف مذہب اور سائنس میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے بلکہ ان میں ایک گونہ مطابقت بھی پائی جاتی ہے ۔ اس مضمون میں اسی اجمال کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے ۔

ہوش و خرد اور جذب و جنوں یعنی ایمان اور یقین کا امتزاج اقبال کے فلسفہ کا خصوصی عنصر ہے اور ان کے کلام میں شروع ہی سے اس کا اشارہ ملتا ہے چنانچہ بانگ درا کا ایک شعر ہے :-

''الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری ، مجھے سر پیرہن نہیں ہے'' (۱)

۱- بانگ درا ، طبع بست و دو ، ۱۹۶۳ ، صفحہ ۱۴۳

اسی طرح ضرب کلیم میں ''عقل اور دین'' کے عنوان سے فرماتے ہیں :-

''وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم'' (۱)

اسی نکتے کی تشریح کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی میں نہایت اندیشہ اور کمال جنون دونوں پائے جانے چاہئیں ، اور قبائے جنون کو قامت خرد پر موزوں کرنا چاہیے ۔ اس کائنات میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ نور حق کی وساطت ہی سے دیکھتے ہیں اور حکمت اشیا جو اسرار حقیقت کو نمایاں کرتی ہے اس کی بنیاد قرآنی حکم ''انظر'' ہی پر رکھی گئی ہے ۔ اس نکتہ کو جاوید نامہ میں نہایت بلیغ پیرایہ میں یوں بیان کیا گیا ہے :-

''علم تا از عشق برخوردار نیست — جز تماشا خانۂ افکار نیست
ایں تماشا خانہ سحر سامری است — علم بے روح القدس افسوں گری است (۲)
گفت حکمت را خدا خیر کثیر — ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر (۳)
چشم او بر واردات کائنات — تا بہ بند محکمات کائنات
دل اگر بندد بہ حق پیغمبری است — ورنہ حق بیگانہ گردد کافری است
علم بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاہوتیاں
بے محبت علم و حکمت مردۂ — عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیر قرآنش کنی'' (۴)

اقبال کے منظوم کلام میں سے یہاں صرف چند شعر پیش کئے گئے ہیں جن میں انہوں نے ذکر اور فکر کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنے کی تلقین کی ہے ۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار شرح و بسط کے ساتھ اور مدلل پیرایہ میں انہوں نے اپنے خطبات میں کیا ہے اور اب میں ان ہی خطبات کی طرف رجوع کرتا ہوں ۔

۱- ضرب کلیم ، طبع دوازدھم ، ۱۹۶۵ ، صفحہ ۱۹ ۔
۲- جاوید نامہ ، طبع چہارم ، ۱۹۵۹ ، صفحہ ۴ ۔
۳- پیام مشرق ، طبع دہم ، ۱۹۶۳ ، صفحہ ۶ ۔
۴- جاوید نامہ ، صفحے ۸۲ - ۸۳ ۔

اقبال نے اپنے خطبات کے دیباچے میں وضاحت کر دی ہے کہ اس دور کا انسان جس نے کائنات کی ہر شے کے متعلق سوچنے سمجھنے کی عادت ڈال لی ہے اور جس کو خود اسلام نے اس قسم کے غور و فکر کی تعلیم دی ہے ، مذہب کے متعلق وہ داخلی کیفیت نہیں پیدا کر سکتا جس پر در اصل دین کا دار و مدار ہوتا ہے ۔ اس لئے اس قسم کا ذہن رکھنے والے انسانوں کا یہ مطالبہ کہ مذہب کے متعلق معلومات کو مدلل پیرایہ میں پیش کیا جائے ، بالکل قدرتی ہے اور اقبال کہتے ہیں کہ اسی مطالبہ کی تکمیل کے لئے انہوں نے یہ خطبات تحریر کئے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ طبیعی سائنس کی بنیادوں میں تبدیلی ہو رہی ہے اور اس تبدیلی کے باعث وہ مادیت جو سائنس کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی معدوم ہوتی جا رہی ہے ۔ اب وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے میں ایسی ہم آہنگی محسوس کریں جس کا اس سے قبل خیال بھی نہیں آسکتا تھا ۔

جدید سائنس کے بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال اپنے خطبات میں اس امر کی تشریح کرتے ہیں کہ طبیعی سائنس جس کی تشکیل ان بنیادوں پر کی گئی ہے مادیت کو خیرباد کہہ چکی ہے اور اب حقیقت کے متعلق سائنس کے تصور اور مذہب کے تصور میں کوئی تضاد نہیں ہے ۔ وہ بتاتے ہیں کہ سائنس حقیقت کو ایک باضابطہ منظم وحدت کے طور پر نہیں پیش کرتی بلکہ اس کے مختلف اجزا سے فرداً فرداً بحث کرتی ہے ۔ سائنس کی تین بڑی قسمیں مادہ ، زندگی اور ذہن سے متعلق علوم پر یعنی طبیعی ، حیاتی اور نفسیاتی علوم پر مشتمل ہیں اور اسی سے سائنس کی محدود رسائی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر علم حقیقت کا صرف ایک ہی پہلو پیش کر سکتا ہے اور مکمل حقیقت کو نہیں بیان کر سکتا کیونکہ سائنس کا طریق کار ہی کچھ اس قسم کا ہے ۔ اس کے برعکس مذہب حقیقت کو بحیثیت ایک وحدت کے محسوس کرتا ہے اور اس لئے اس کو سائنس سے ، جو حقیقت کے اجزا سے بحث کرتی ہے ، کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہو سکتا ۔

پھر آگے چل کر اقبال بتاتے ہیں کہ مذہب کو معقول بنیادوں پر استوار کرنا ضروری ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ مذہب کی روح عقیدہ اور ایمان ہے

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایمان محض احساسات اور جذبات سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور اس میں غور و فکر کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے ۔ اقبال کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

"Yet it cannot be denied that faith is more than mere feeling. It has something like a cognitive content." (۱)

اس کے علاوہ مذہب چونکہ ان عام صداقتوں پر مشتمل ہوتا ہے جو انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور چونکہ انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کی تشکیل اور رہنمائی مذہب کا مقصود اور منتہا ہے اس لئے اقبال کے خیال میں مذہب کی ان صداقتوں کو غیر معین نہیں چھوڑا جا سکتا ۔ کوئی شخص اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ اپنے عمل کی بنیاد مشتبہ اصولوں پر رکھے اور یہی وجہ ہے کہ مذہب کے لئے سائنس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ اس کی تشکیل معقول بنیادوں پر کی جائے ۔

اقبال پروفیسر Whitehead کے اس خیال سے متفق ہیں کہ جب کبھی مذہب کو فروغ ہوتا ہے تو وہی زمانہ معقولیت کا بھی ہوتا ہے یعنی :

"The ages of faith are the ages of rationalism." (۲)

اقبال کہتے ہیں کہ وجدان اور فکر کو ایک دوسرے کے مقابل اور متضاد سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ یہ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے نمودار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں ۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عقل حقیقت کا تجزیہ کرکے اس کو جزواً جزواً سمجھتی ہے اور وجدان اس کو یکلخت بحیثیت مجموعی اخذ کر لیتا ہے ۔ دونوں کو اپنی نشو و نما کے لئے ایک دوسرے

۱- S. M. Iqbāl, *The Reconstruction of Religious Thought in Islām* (Reprint; Lahore: Shaykh Muḥammad Ashraf, 1968), p. 1.

۲- *Ibid*, p. 2.

کی ضرورت ہے ۔ اقبال برگساں کی اس رائے سے متفق ہیں کہ وجدان کی حیثیت ایک اعلیٰ قسم کے عقل کی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

"In fact, intuition, as Bergsan rightly says, is only a higher kind of intellect."[1]

اقبال کی رائے ہے کہ فطرت کا سائنسی مشاہدہ ہمیں حقیقت مطلقہ کے طرز عمل سے قریب تر رکھتا اور اس میں گہری بصیرت کے لئے ہمارا اندرونی ادراک تیز تر کر دیتا ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ علم کی ہر جستجو عبادت ہی کی ایک شکل ہے اور اس لئے فطرت کا سائنسی مشاہدہ بھی کچھ ویسا ہی فعل ہے جیسے حقیقت کی طلب میں صوفی کا سلوک و عرفان کی منزلیں طے کرنا ۔اس میں شک نہیں کہ بحالت موجودہ اس کی نگاہیں گام آہو پر ہیں لیکن اس کی تشنگی علم اسے بہت جلد اس مقام پر لے جائے گی جہاں گام آہو کی بجائے ناف آہو اس کی رہبری کرے گا ۔ اس طرح عالم فطرت پر اسے مزید غلبہ حاصل ہوگا اور اسی طرح لامتناہی کائنات میں اسے وہ بصیرت حاصل ہوگی جس کی فلسفہ کو آرزو تو ہے لیکن جس کا پانا محال ہے ۔

اقبال بتاتے ہیں کہ مذہب کو معقول بنیادوں پر استوار کرنے کا کام خود پیغمبر اسلام صلعم ہی نے شروع فرمایا تھا جن کی مستقل دعا یہ تھی کہ ''اے خدا مجھے اشیا کی حقیقت کا علم عطا فرما''۔ یونانی فلسفہ کے برخلاف قرآن میں عالم محسوسات کو مشاہدہ کرنے اور اس سے حقیقت کا پتہ چلانے میں مدد لینے کی تلقین کی گئی ہے ۔ اپنے پانچویں خطبہ میں اسلامی ثقافت کی روح کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے ۔ وہ بتاتے ہیں کہ انسان جذبات کا بندہ ہے اور جبلتوں سے مغلوب رہتا ہے ۔ وہ اپنے ماحول کی تسخیر کر سکتا ہے تو صرف عقل استقرائی کی بدولت ۔ اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے ۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ خارجی سہاروں پر بسر نہیں کر سکتا ۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل اسی طرح ہو سکتی ہے کہ وہ خود اپنے وسائل سے

---

[1] *Ibid*, p. 3 - ۱

کام لینا سیکھے - یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مذہبی پیشوائی کو ختم کیا - بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا اور عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا - انہی دو سرچشموں سے استفادہ کرنے میں اسلامی روح کا بہترین اظہار ہوا ہے - قرآن کے نزدیک اجرام فلکی کا طلوع و غروب ، سایوں کا طویل ہونا ، دن رات کا بدل بدل کر آنا ، رنگ اور زبان کا فرق ، قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دور ، غرض یہ سارا عالم فطرت جس کا ادراک ہمیں اپنے حواس کے ذریعہ ہوتا ہے ، حقیقت مطلقہ کی نشانیوں سے بھرپور ہے اور اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و فکر سے کام لے - یہ نہیں کہ اندھوں اور بہروں کی طرح ان سے اعراض کر لے کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں ان نشانیوں سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آئندہ زندگی کی حقیقتوں سے بھی اندھا ہی رہے گا -

''ومن کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی و اضل سبیلا'' -

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عالم فطرت اور تسخیر قوائے فطرت کو اقبال حیات ملی کی توسیع اور استحکام کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں چنانچہ ''رموز بیخودی'' میں اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں :-

''ماسوا از بہر تسخیر است و بس — سینۂ او عرصۂ تیز است و بس
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرۂ تعمیر کرد
کوہ و صحرا ، دشت‌ودریا ، بحر و بر — تختہ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیر افیون خفتۂ — عالم اسباب را دون گفتۂ
غائیش توسیع ذات مسلم است — امتحان ممکنات مسلم است
حق جہاں را قسمت نیکاں شمرد — جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
تا ز تسخیر قوائے این نظام — ذو فنونیہائے تو گردد تمام
نائب حق در جہاں آدم شود — برعناصر حکم او محکم شود''(۱)

اقبال کے نزدیک یہ خیال کہ فکر چونکہ محدود ہوتی ہے اس لئے لامحدود کو نہیں سمجھ سکتی ، علم میں فکر کی حیثیت سے متعلق غلط فہمی پر مبنی ہے -

---

۱- رموز بیخودی ، طبع ششم ، ۱۹۶۳ ، صفحے ۱۶۴ - ۱۶۶ -

یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ فکر کو ساکت اور جامد سمجھ لیا گیا حالانکہ وہ متحرک ہے اور اپنی داخلی لامحدودیت کو بتدریج ظاہر کرتی جاتی ہے - یہ اس تخم کی مانند ہے جو شروع ہی سے اپنے اندر پورے درخت کی وحدت کو سموئے ہوئے ہوتا ہے - اس ذرے میں ایک پورا کل پوشیدہ ہے اور اسی کل کو قرآن کریم میں لوح محفوظ کہا گیا ہے ، جس میں تمام عالم موجود ہے اور جن کا اظہار بتدریج ہو رہا ہے - اقبال بتاتے ہیں کہ ہم اس کائنات کی جزوی حقیقتوں پر غور کرتے کرتے ہی لامحدود کا تصور کرنے کی تربیت حاصل کرتے ہیں اور اسی لئے قرآن میں بار بار مظاہر فطرت کے مشاہدے اور ان کے متعلق غور و فکر کی تاکید کی گئی ہے -

فکر اور وجدان کے اس باہمی تعلق کو اقبال نے نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے غور و فکر کے ساتھ فطرت کے مشاہدے کی تلقین کی تو اس لئے کہ ہم اس حقیقت کا شعور پیدا کریں جس کی ایک نشانی عالم فطرت ہے - وہ قرآن کریم کی اس حقیقت پسندانہ روش کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس سے مسلمانوں کے اندر عالم واقعیت کا احترام پیدا ہوا اور جس کی بدولت انہوں نے جدید سائنس کی بنیاد ڈالی - قرآن نے انسان کی عمل پسندانہ یعنی Empirical روش کو اس کی روحانی زندگی کا ایک ناگزیر مرحلہ ٹھہرایا - قرآن مجید کی فطرت پسندی محض اس امر کا اعتراف ہے کہ انسان فطرت سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی قوائے فطرت پر قابو حاصل کرنے کا ایک ممکن ذریعہ ہے - آخر میں اقبال اس امر کی تشریح کرتے ہیں کہ خصوصاً موجودہ سائنسی دور میں انسانوں کو مذہب کی کس قدر ضرورت ہے - وہ کہتے ہیں کہ جس مایوسی اور دل گرفتگی میں آج کل کی دنیا گرفتار ہے اور جس کے زہر اثر انسانی تہذیب کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہے اس کا علاج نہ تو عہد وسطی کی صوفیانہ تحریک سے ہو سکتا ہے اور نہ جدید زمانے کی وطنیت اور لادینی اشتراکیت سے - اس وقت دنیا کو حیات نو کی ضرورت ہے - اگر عصر حاضر کا انسان وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھا سکے گا جو جدید سائنس نے اس پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت - صرف اسی طرح اس کے اندر ایمان اور یقین کی اس کیفیت کا احیا ہوگا جس کی بدولت وہ اس زندگی میں اپنی اقدار اعلیٰ کو محفوظ اور برقرار رکھ سکے گا -

فکر و ذکر اور عقل و عشق کے امتزاج کی یہی قرآنی تعلیم ہے جس کو اقبال نوع انسان کی نجات کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور جس کو انہوں نے نہایت دل نشین اور وجد آفرین انداز میں اپنے منظوم کلام میں جابجا پیش کیا ہے ۔ ایسی عقل کو جو عشق سے بہرہ ور ہو وہ ''حکمت کلیمی'' کے لقب سے موسوم کرتے ہیں اور اس کا موازنہ ''حکمت فرعونی'' سے کرتے ہیں جو آج کل مغرب پر مسلط ہے اور یہ ساری تباہی پھیلا رہی ہے ۔ ایک طرف تو حکمت کلیمی ہے جو سمجھتی ہے کہ :-

''ہرچہ می بینی ز انوار حق است — حکمت اشیا ز اسرار حق است
ہر کہ آیات خدا بیند ہر است — اصل ایں حکمت ز حکم 'انظر' است (۱)
معنیٔ جبریل و قرآن است او — فطرۃ اللہ را نگہبان است او'' (۲)

اور دوسری طرف حکمت فرعونی جس کی تاثیر ہی جدا ہے :-

''حکمتے از بند دیں آزادۂ — از مقام شوق دور افتادۂ (۳)
می شود در علم و فن صاحب نظر — از وجود خود نگردد باخبر (۴)
علم از و رسوا ست اندر شہر و دشت — جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
عقل اندر حکم دل یزدانی است — چوں ز دل آزاد شد شیطانی است'' (۵)

اقبال کو یقین ہے کہ ایسی ہی عقل جو ادب خوردۂ دل ہو اور جس کی بنیاد کتاب و حکمت دونوں پر رکھی گئی ہو ۔ بنی آدم کو گمراہی سے نجات دلا سکتی اور صحیح راستہ دکھا سکتی ہے ۔ اور وہی انسان جس کی سرشت میں ایمان اور عقل کا مناسب امتزاج ہو ایک ایسی نئی دنیا تعمیر کرسکتا ہے جو اس کی تحقیقی قوتوں کے لئے سازگار ہو :-

---

۱- بس چہ باید کرد ، طبع ششم ، ۱۹۶۶ ، صفحہ ۵۷ ۔
۲- ایضاً ، صفحہ ۱۲ ۔
۳- ایضاً ، صفحہ ۱۶ ۔
۴- ایضاً ، صفحہ ۱۲ ۔
۵- ایضاً ، صفحے ۵۷ - ۵۸ ۔

"برگ و ساز ، کتاب و حکمت است — این دو قوت اعتبار ملت است
آں فتوحات جہاں ذوق و شوق — ایں فتوحات جہاں تحت و فوق
ہر دو انعام خدائے لایزال — مومناں را آں جمال است ایں جلال (۱)
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہم بر شود — نقش بند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیزدہ" (۲)

۱- مسافر ، طبع ششم ، ۱۹۶۶ ، صفحہ ۳۰ -
۲- جاوید نامہ ، صفحہ ۷۱ -